R.No.2186/57

REGD. N.L.922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۰ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱- ۸- ۱۵- ۲۲

جلد ۲۸- شمارہ ۵	ایڈیٹر: آل احمد سرور	یکم فروری ۱۹۶۹ء

آل احمد سرور

سمپورنانند — ایک تاثر

ابھی حال میں سمپورنانند جی ایک طویل علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

سمپورنانند کو لوگوں نے اس وقت جانا جب وہ اتر پردیش کی پہلی کانگریسی وزارت میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے آئے۔ ان سے پہلے پیارے لال شرما وزیر تعلیم تھے مگر ان سے پارٹی والوں کی نہیں بنی اور وہ وزارت سے الگ ہوگئے۔ سمپورنانند کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے بانیوں میں شامل تھے، مگر جلد اس سے الگ ہوگئے۔ وہ ہندی کے ممتاز ادیب اور عالم تھے اور ہندی کے پرجوش مبلغ بھی تھے۔ کایستھوں میں پہلے اردو بلکہ فارسی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھوں نے بھی اردو اور فارسی پڑھی تھی، مگر نہ معلوم کیا نفسیاتی گرہ تھی کہ آگے چل کر اردو کے وہ بہت بڑے مخالف بن گئے اور اردو دوستوں کو ان کے طرز عمل سے بجا شکایت رہی۔

سمپورنانند جی نہ صرف ہندی کے ایک عالم اور ادیب تھے۔ وہ بڑی اچھی انگریزی لکھتے تھے اور انگریزی میں تقریر بھی خوب کرتے تھے۔ وہ ایک مضبوط کردار کے آدمی تھے۔ ان کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا۔ عام سیاسی لیڈروں کی طرح ان کے یہاں کبھی دربار نہیں لگتا۔ اپنے پیش رو گووند بلبھ پنت سے وہ کئی باتوں میں بہت مختلف تھے۔ پنت جی کے یہاں وقت کی پابندی کا کوئی سوال نہ تھا۔ بقول پنڈت کشن پرشاد کول وہ بڑے گھاگ آدمی تھے۔ سبھی کو باتوں میں بہلائے رکھتے تھے۔ سمپورنانند ان کی ضد تھے۔ کھرے آدمی تھے۔ وقت کے نہایت پابند لمبی باتوں کے لئے ان کے پاس فالتو وقت کبھی نہ ہوتا تھا۔ وہ چند منٹ میں معاملہ کی بات کرکے انٹرویو ختم کر دیتے تھے۔ کوئی بات مان لیتے تو وہ ہو جاتی۔ انکار کر دیتے تو پھر ان کو راہ پر لانا مشکل ہوتا۔

وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کا فرض یہ تھا کہ ریاست کی تعلیم میں اکثریت اور اقلیت سبھی کے حقوق کا خیال رکھیں۔ مگر سمپورنانند جی ہندی کے پرزور مبلغ تھے اور انھوں نے اپنے زمانے میں اردو کے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔ اردو دوستوں کے مطالبات پر انھوں نے کبھی ہمدردی سے غور نہیں کیا۔ ہندی کی تعلیم کو سب پر لادنے کے معاملے میں انھوں نے خاصے جوش سے کام لیا۔ جب کبھی لکھنؤ کے انگریزی اخباروں میں اردو کی حمایت میں مضامین یا خطوط شائع ہوئے تو سمپورنانند جی نے جواب میں برابر ان کی مخالفت کی۔ وہ اردو ہی نہیں ہندوستانی کے بھی مخالف تھے۔ پہلی دفعہ جب لکھنؤ میں ان سے ملاقات ہوئی تو اسی سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوگیا۔ مولانا محمد میاں جمعیۃ العلماء کی طرف سے اردو کے سلسلے میں کچھ مطالبات لے کر لکھنؤ آئے اور مجھ سے ملے۔ انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے ساتھ پنت جی اور سمپورنانند جی سے ملوں۔ پنت جی کے یہاں پہنچے تو ایک دربار لگا ہوا تھا۔ مگر پنت جی جب آئے تو چند منٹ خاص شفقت سے باتیں کیں، پھر یہ کہا کہ یہ مطالبات سمپورنانند جی کے پاس لے جائیے میں ان سے بات کروں گا۔ مگر تم لوگوں کا وزیر تعلیم سے ملنا ضروری ہے۔ خیر ہم لوگوں نے وقت مقرر کرایا۔ صبح ساڑھے چھ بجے کا وقت مقرر ہوا۔ پہنچے تو سمپورنانند ہمارے منتظر تھے۔ پنت جی کے یہاں ہمیں ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ انھوں نے نہایت سرد لہجے میں بات کی۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستانی کو برقرار رکھا جائے۔ جس کی گاندھی جی اور جواہر لال نہرو دونوں نے حمایت کی تھی۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہا کہ یہ مطالبہ آپ مرکز کے پاس لے جائیے۔ مجھ سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور میں ہندوستانی سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ اتر پردیش میں اردو کی اہم پوزیشن کو دیکھتے ہوئے ہندی کے ساتھ اردو کی تعلیم بھی آٹھویں درجے تک لازمی طور پر ہو اور ہائی اسکول تک وہ تمام سہولتیں برقرار رکھی جائیں جو ۱۹۴۷ء تک اردو کے طالب علموں کو ملتی تھیں یعنی اردو میں جواب لکھنے کی اجازت ہو اور انگریزی ترجمے کا پرچہ ہندی کے ساتھ اردو میں بھی ہو۔ اس پر فرمایا کہ اس صوبے کے باشندوں کی زبان ہندی ہے۔ شاید پانچ فی صدی مسلم آبادی اور وہ بھی شہروں کی اردو بولتی ہے۔ اتر پردیش میں اب اکثریت کی زبان چلے گی۔ جو سہولتیں آپ مانگتے ہیں وہ نہیں دی جاسکتیں۔ میں نے ہائی اسکول کے طلبہ کے اعداد و شمار پیش کیے۔ ۵۰-۱۹۴۹ء ۴۹-۱۹۴۸ء میں جن طلبہ نے اپنی پہلی زبان اردو لکھائی تھی اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ ہائی اسکول میں کیا تھا ان کی تعداد طلبہ کی کل تعداد کی

تھی میں نے کہا کہ مسلمانوں کی آبادی ریاست کی کل آبادی کی پندرہ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے۔ پہلی زبان اردو لکھانے والوں کی تعداد مسلمانوں کی آبادی سے زیادہ ہے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اردو کچھ شہری مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس پر برہم ہو کر فرمایا کہ یہ سب باتیں انگریزوں کے دور کی تھیں میں ان اعداد و شمار کو بالکل نہیں مانتا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد گفتگو ختم ہو گئی۔

دوسری دفعہ ان سے ملاقات ایک اور وفد میں ہوئی جس کے سربراہ مولوی عبدالحق تھے۔ اس وفد میں کشن پرشاد کول اور آمنہ زماں کے علاوہ ایک خاتون بھی تھیں۔ سمپورنانند جی شلوکے میں ملبوس تھے اور دھوتی ایسی پہنے تھے کہ پنڈلیاں ہی نہیں گھٹنے بھی کھلے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے اپنے مطالبات پیش کئے۔ انھوں نے بہت مختصر جوابات دئے اور ہمارے مطالبے نامنظور کر دئے۔ مولوی عبدالحق نے کچھ بحث کرنا چاہی، مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دس منٹ کے بعد ہم لوگ رخصت ہو گئے۔ سارے وقت سمپورنانند جی کے ماتھے پر شکن رہی۔ مولوی عبدالحق نے باہر نکل کر کہا کیا یہ شخص کبھی مسکراتا بھی نہیں۔

ہم اردو والے خاصے ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں اور قومی معاملات میں ڈھیٹ ہونا ہی پڑتا ہے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ سابقہ وزیر تعلیم سے ہی پڑنا تھا چنانچہ کچھ دن کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین کی سرکردگی میں پھر ایک وفد لے کر گئے۔ سمپورنانند جی ایک کمرے میں چپڑ کے بکسوں میں ہندی کی نئی کتابیں نکال رہے تھے۔ ہم لوگ مقررہ وقت پر داخل ہوئے۔ انھوں نے بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا مگر اپنا شغل جاری رکھا۔ کمرے میں کرسیاں کم تھیں۔ پھر سمپورنانند بھی کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم لوگ کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چونکے، اور کرسیاں منگائیں اور پھر ہم لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ ذاکر صاحب نے ہمارے مطالبات پڑھ کر سنائے۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ وزارت تعلیم کا وہ حکم جس کی رو سے اتر پردیش میں سبھی کی مادری زبان ہندی قرار دے دی گئی ہے منسوخ کیا جائے۔ دوسرے مطالبات ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، دفاتر، عدالتوں اور مقابلے کے امتحانات میں اردو کے چلن سے متعلق تھے۔ فرمانے لگے کہ مادری زبان کے متعلق حکم میں ترمیم کر دی جائے گی اور جو لوگ اپنی زبان اردو لکھوانا چاہتے ہیں انھیں اس کی اجازت ہوگی۔ باقی مطالبات کے متعلق وہی ایک مرغے کی ایک ٹانگ۔ زیادہ بحث کی گنجائش نہ دیکھ کر ہم سب خاموشی سے چلے آئے۔

اسی زمانے میں رشید صاحب کو ایک خط لکھا جس میں سمپورنانند کے طرز عمل کی شکایت تھی اور یہ بھی کہ اس بات پر اور بھی دکھ ہوا کہ انھوں نے ذاکر صاحب جیسے شخص کی بھی مناسب پذیرائی نہیں کی۔ رشید صاحب نے ایک لمبا سا خط لکھا جس میں یہ جملہ بھی تھا کہ میں سمپورنانند کی کیا شکایت کروں۔ مجھے کانگریس ہی کا رویہ یاد ہے۔ میرے نزدیک سمپورنانند کے یہاں شاید مزاج کی خشکی کے علاوہ اس زمانے میں اقتدار کا نشہ بھی تھا۔

سمپورنانند صرف اردو کے مخالف ہی نہ تھے۔ وہ سیکولرزم کے بھی مخالف تھے۔ انھوں نے اپنی کئی تحریروں میں سیکولرزم کی سختی سے مخالفت کی۔ مجھے اکثر محسوس ہوتا کہ جو سیکولرزم کا مخالف ہوگا وہ اردو کا ہمدرد نہیں ہو سکتا کیونکہ سیکولرزم کے معنی صرف مذہبی معاملات میں غیر جانبدار ہونا ہی نہیں۔ اقلیتوں کے سارے معاملات کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا لسانی سیکولر نقطۂ نظر سے دیکھنا اور ان کو حل کرنے کی برابر کوشش کرنا ہے۔ اور اطمینان کے معنی ان لوگوں کے اطمینان کے ہیں جن کا معاملہ ہے۔ حکومت یا اکثریت کے اطمینان کے نہیں۔ سمپورنانند کو کچھ لوگ جن سنگھی سمجھتے تھے۔ یہ صحیح نہیں۔ وہ کانگریسی تھے اور سوشلزم پر بھی اعتقاد رکھتے تھے۔ مگر ان کی قوم پرستی پر احیا پرستی کی چھاپ تھی۔ یوں وہ اردو میں شعر بھی کہتے تھے اور کچھ لوگ ان کی بعض مشاعروں میں شرکت اور صوفیانہ اشعار سے متاثر بھی ہو جاتے تھے۔ مگر اصل میں اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں۔ اہمیت ان کی محدود اور جارحانہ قوم پرستی کی ہے جس کی وجہ سے آزاد ہندوستان کی تاریخ میں میرے نزدیک ان کا رول منفی ہی نہیں بلکہ غلط رول کا ہے۔ ان جیسے لوگوں نے ہندی کی حمایت اس طرح کی کہ دوسری زبانوں کے بولنے والوں کو محسوس ہوا کہ وہ ٹاٹ باہر ہیں۔ انھوں نے ہندی سامراجیت کو فروغ دیا۔ ان میں خاصی ضد اور خود رائی تھی اور اپنے مخالف نقطۂ نظر کو وہ سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے تھے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کا طرز عمل کچھ ایسا خشک تھا کہ چندر بھان گپتا نے بہت جلد سیاست کے اکھاڑے میں انھیں پچھاڑ دیا۔ ان کے دوست اور جاں نثار بہت کم تھے۔ ہاں ان کے مخالف بھی ان کی قابلیت کی وجہ سے ان کا احترام ضرور کرتے تھے۔ مگر کوئی نہ کوئی تنازعہ (CONTROVERSY) برابر ان کے ساتھ رہا۔ راجستھان کے گورنر کی حیثیت سے جس طرح انھوں نے حزب مخالف کو نظر انداز کیا اور صدر کانگریس کی حمایت کی، اس کی وجہ سے ملک میں ان پر خاصی لے دے ہوئی۔ ویسے معاملات میں وہ صاف آدمی تھے۔ اچھے اور قابل ماتحت افسروں کی برابر حمایت کرتے تھے۔ جب وہ وزیر تعلیم تھے تو ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں ناظم تعلیمات تھے سمپورنانند ان کے بہت قائل تھے۔ انھیں اپنے گھر میں بغیر مٹی کے پیڑ اگانے کا بہت شوق تھا۔ جوتش اور سائنسی افسانوں سے بھی خاصا شغف تھا۔ گورنری سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ کاشی ودیا پیٹھ کے چانسلر ہو گئے تھے یہاں بھی وہ انتظامی معاملات میں اکثر دخل دیا کرتے تھے۔ حکومت کرنے کی عادت پڑ جائے تو مشکل سے جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بچپن کے نقوش زندگی بھر محو نہیں ہوتے۔ مگر سمپورنانند کے معاملے میں یہ کلیہ غلط ثابت ہوا۔ سمپورنانند نے بچپن میں اردو اور فارسی پڑھی تھی یہ جانے کیا نفسیاتی گرہیں تھیں جن کے باعث انھیں اردو زبان و ادب سے کچھ کد سی تھی ہو سکتا ہے کہ انھیں کسی نہایت جلاد قسم کے استاد سے واسطہ پڑا ہو۔ سمپورنانند اور آچاریہ نریندر دیو قریب قریب ہم عمر تھے۔ دونوں سوشلسٹ تھے۔ مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نریندر دیو میں دلنوازی تھی۔ رواداری تھی، شگفتگی تھی سمپورنانند میں کھرا پن، تنگ نظری اور یبوست۔ نریندر دیو ہماری مشترک تہذیب کے علمبردار تھے سمپورنانند اس جارحانہ قومیت کے سپاہی جو ہندوستان کی تاریخ کے درمیانی دور کو نظر انداز کرنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کی نجات جواہر لال نہرو اور نریندر دیو کے راستے پر چلنے میں ہے، پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنانند کے راستے پر چلنے میں نہیں۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ہمارا اختلاف اس ذہنیت سے اور اس سرکاری اور پبلک رول سے ہے جو سمپورنانند جی کا تھا۔ ان کی ذاتی قابلیت، ان کے کردار کی مضبوطی اور ان کی عالمانہ شان کا ہمیں اعتراف ہے۔

ابن حسین

اوما شنکر جوشی

اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر اوما شنکر جوشی گجراتی ادب میں ایک بہت ہی اونچا مقام رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں اور ان کی شاعری نہ صرف یہ کہ گجراتی ادب کی بہترین شعری روایات کی حامل ہے بلکہ اس میں سنسکرت شاعری کے جمالیاتی عناصر اور بھارتی تہذیب کے رنگا رنگ شگوفوں کی نکہت کے ساتھ ساتھ مغربی شاعری کے وسیع مطالعہ سے متاثر ایک باشعور جدید ذہن کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن اوما شنکر جوشی صرف شاعر نہیں ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں ناول بھی اور ناولٹ بھی۔ ان کے ایکانکی ڈراموں سے گجراتی ڈرامے نے نئی تازگی پائی اور فن اور احساس کی نئی سرحدوں سے روشناس ہوا۔ ان کے انشائیے گو غیر معمولی نہیں لیکن اپنا ایک لطف رکھتے ہیں۔ تحقیق کے وہ مرد میدان ہیں اور گجراتی زبان کی بے شمار کتابوں کو انھوں نے تحقیقی اور عالمانہ طور پر مدوّن اور مرتب کیا ہے۔ لیکن دنیائے تحقیق میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ "پورانوں میں گجرات" ہے جس میں انھوں نے پورانوں میں گجرات کی تاریخ، تہذیب اور تمدن سے متعلق معلومات اخذ کی ہیں۔ وہ نقاد بھی ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ شاعری کے بعد ان کی دوسری اہم حیثیت ایک نقاد کی ہی ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ تنقیدی مضامین پر مشتمل ان کی کم از کم آٹھ دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تنقید میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی فکری گہرائی اور سوچنے کا اپنا انداز ہے۔ اوما شنکر جوشی کبھی کبھار بھولے سے شاید اپنی باتوں کو دہرا دیتے ہوں لیکن انھوں نے تنقید میں کبھی بھی کسی کی باتوں کو نہیں دہرایا۔ دوسرے نقادوں کے خیالات و افکار کو تفصیلی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرنے کا جو طریقہ عموماً تنقید میں مروج ہے اوما شنکر نے ہمیشہ اس سے پہلو بچایا اور جب تک کسی بھی شاعر یا ادبی تخلیق کے متعلق ان کے پاس کوئی نئی فکر انگیز بات کہنے کو نہ ہوئی انھوں نے تنقید کے لئے قلم نہیں اٹھایا۔ کشتلا جیسے پامال موضوع کو انھوں نے نئے انداز سے چھیڑ کر اپنی ذہنی جودت کا سکہ بٹھا دیا۔ اپنی تنقیدوں کے ذریعہ انھوں نے گجراتی کے پرانے شاعروں کے ادبیوں سے متعلق پڑھنے والوں کو ایک نیا فکر انگیز نقطۂ نظر دیا۔ ان کی تنقیدی اپج کا لوہا تو اس وقت ماننا پڑتا ہے جب وہ گجراتی اور سنسکرت شاعروں کے علاوہ عالمگیر شہرت رکھنے والے فنکاروں پر قلم اٹھاتے ہیں۔ ایلیٹ، اندرا پاؤنڈ، سارتر، شاہن بکس اور چیخوف کے متعلق ان کی رائیں بالکل اپنی ہیں اور ان فنکاروں کی بعض ایسی خوبیاں انھوں نے اجاگر کی ہیں جن کا ذکر مغربی تنقید میں بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کی تنقید میں ایک لالہ زار سا ہے جس میں مشرق و مغرب کے غنچوں کی آبیاری انھوں نے اپنے جوئے فکری سوتوں کے تبسم جل سے کی ہے۔

اوما شنکر جوشی دبلے پتلے سیدھے سادے سے بے تکلف قسم کے آدمی ہیں عینک کے پیچھے ان کی تجسس نگاہیں ہمیشہ کچھ سوچتی رہتی ہیں۔ بات چیت بے تکلفی سے لیکن شرمیلے انداز میں کرتے ہیں۔ بات کا ابھرنا ہونٹوں سے اس طرح آہستہ آہستہ اٹک اٹک کر ہوتا ہے گویا انھیں خود شک ہو کہ جو بات وہ پیش کرنا چاہتے ہیں اسے مناسب طریقہ پر ادا کر سکیں گے یا نہیں۔ ان کے اس انداز سے ان کا مخاطب کچھ احساس بے چینی محسوس کرتا ہے اور اس کو جی چاہتا ہے کہ بیچ بات کے لقمہ دے کر جوشی صاحب کو اعتماد دلا دے کہ وہ ان کی بات سمجھ گیا ہے اور اب انھیں اظہار کے لئے زیادہ ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب جوشی صاحب کی زبان سے پورا جملہ ادا ہو جاتا ہے اور پھر یکے بعد دیگرے نپے تلے متناسب سبک اور سڈول جملے ان کے منہ سے ادا ہونا شروع ہوتے ہیں تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ جو شخص اتنے خوبصورت جملے ایسی برجستگی سے بول سکتا ہے وہ اتنے شرمیلے اور مذبذب انداز میں کیوں بولتا۔ دراصل ہم جسے ہچکچاہٹ سمجھ کر ان کے لہجہ کا مذبذب سمجھتے ہیں وہ ان کے اظہار بیان کی پیچیدگی ہوتی ہے جو ان کے بل کھاتے ہوئے خیالات کا

ماہر القادری

محسوسات

اپنی آشفتہ سری پر ہے بہت ناز مجھے
آپ کر سکتے نہیں اب نظر انداز مجھے

بازوؤں ہی میں سکت ہے نہ وافق پہ فضا
مار ڈالے گی یہی کوششِ پرواز مجھے

چشمِ مشتاق نے وہ چوٹ لگائی ہے کہ ہائے
یاد رکھے گی نگاہِ غلط انداز مجھے

ان کی محفل سے اٹھا پھر نہ پلٹ کر دیکھا
وہ بھی دیتے رہے آواز پہ آواز مجھے

جانے کس حال میں کس وقت مرا آنا ہو
خوب پہچان لے اے انجمن ناز مجھے

تسلیم ہوتی ہے۔ ان کے انداز گفتگو پر تفصیل سے میں نے اس لئے لکھا کہ جوشی صاحب گجرات کے ایک نامور مقرر بھی ہیں اور ان کی تقریریں وہی لطف ہے جو کسی آہستہ خرام لیکن سانپ کی طرح بل کھا کر بہنے والے جھرنے کی دلآویز صدا میں ہوتا ہے

اوماشنکر جوشی کی ملنساری اور انکسار ضرب المثل ہے ان کی دلچسپیاں غیر محدود ہیں۔ وہ عالمی ادب کے علاوہ بنگالی مرہٹی۔ تامل اور ہندی ادب کی اہم تخلیقات اور ان کے تازہ میلانات سے واقف رہتے ہیں۔ اردو ادب سے ان کی دلچسپی پرانی ہے۔ فارسی عروض سے انھیں اچھی خاصی واقفیت ہے۔ کرشن چندر، بیدی، عصمت، منٹو ان کے لئے اجنبی نہیں۔ قرۃ العین حیدر سے ٹوکیو کی پی۔ ای۔ این کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی (جس کا ذکر حیدر کی رپورتاژ میں موجود ہے) اور اکثر ان کی تازہ بتازہ تحریروں کے متعلق مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں۔ جب کبھی ملتے ہیں جوش، فیض اور سردار جعفری کی شاعری کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ داغ اور جگر کے شعر بے تکلف پڑھتے ہیں۔ اردو زبان اور اردو ادب سے انھیں جذباتی لگاؤ ہے اور ملک کی لسانی عصبیت سے وہ بہت کڑھتے ہیں۔ انھیں حال ہی میں پچاس ہزار روپیہ کا جو انعام ملا ہے وہ انھوں نے گجراتی زبان میں غیر زبانوں کے بہترین تراجم کے لئے وقف کر دیا ہے اور غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر منتخب غزلیات غالب کے اردو متن اور گجراتی ترجمہ کی اشاعت کے لئے انھوں نے ایک معقول رقم دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔

اوماشنکر جوشی نے امریکہ اور جاپان کا سفر بھی کیا ہے۔ بہت سی کانفرنسوں کی صدارتیں کی ہیں۔ بہت سی یونیورسٹیوں سے اعزازی ڈگری حاصل کی ہے اور آج وہ گجرات یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ اور بھی بہت کچھ ہیں۔ لیکن جو چیز انھیں تاریخ ادب میں زندہ رکھے گی وہ ان کی شاعری ہے۔ جسے گجراتی ادب میں گاندھی یگ کہا جاتا ہے سندرم اور اوماشنکر جوشی اس یگ کے بہترین شاعر ہیں۔

ان کی شاعری کے لگ بھگ آٹھ دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ہر مجموعہ ان کے شعری ارتقا کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بحیثیت شاعر کے ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی بے پناہ غنائیت ہے۔ گجراتی طالب علم کا ذہن اسکول ہی سے ان کے گیتوں کے سنگیت میں ڈھل کر نکلتا ہے۔ ان کی غنائی شاعری میں کمال کا ترنم اور ایک عجب نشہ آور موسیقانہ کیفیت ملتی ہے۔ ملٹن کی طرح ان کا سامع لفظ کی موسیقی کو پہچانتا ہے اور اس موسیقی سے نہایت ہی سحر انگیز فضا کی تعمیر کرتا ہے۔ غنائیت کی تعمیر میں وہ سنسکرت چھند کے ساتھ ساتھ فارسی عروض سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کی شاعری کی دوسری خصوصیت ان کا دانشورانہ نقطۂ نظر ہے۔ جذباتی شدت کے ساتھ ساتھ فکری ارتفاع ان کی شاعری کی ذہنی سطح کو بلند معیار پر قائم رکھتی ہے۔ ان کے یہاں چھچھلے جذبات۔ جذباتی رومانیت اور مریضانہ انفعالیت پسندی کا نام و نشان نہیں۔ گو زندگی کی انسانی کا فلسفیانہ شعور شدت سے ملتا ہے۔ "میں ٹوٹا پھوٹا ہوں" کا کربناک احساس ان کی نظموں میں جاری و ساری ہے۔ اپنی ذات کی تلاش اور کائنات کے ساتھ اپنے وجود کے رشتہ کی جستجو ان کی شاعری کا موضوع رہی ہے۔ ان کی پہلی اہم اور مشہور نظم "عالمگیر امن" میں وہ صرف انسانوں کے ساتھ ہی پر امن زندگی کا خواب نہیں دیکھتے بلکہ کائنات کی ہر ذی روح شئے۔ جانور۔ پرندے۔ پھول اور درختوں کے ساتھ بھی ایک روحانی ہم آہنگی کا تصور پیدا کرتے ہیں۔ انھیں زمین سے عشق ہے اور ان کی شاعری دھرتی کی بوباس سے رچی بسی ہے۔ مظاہر قدرت اپنی تمام حیرتناک خوبصورتیوں کے ساتھ ان کی شاعری میں جلوہ افروز ہیں۔ فطرت کے حسن اور اس کی آزادی کا خیال ان کو انسان کی مجبوری اور غلامی کا احساس دلاتا ہے اور ان کا لہجہ وہی افسردگی پیدا کر دیتا ہے جس سے میتھیو آرنلڈ کی شاعری کا حزنیہ لب و لہجہ رنگا ہوا ہے۔ اوماشنکر کی شاعری کا تار و پود بھارتی تہذیب و تمدن کے ان رشتوں سے بنا ہوا ہے جو وید اپنشد۔ مہابھارت۔ رامائن۔ حافظ۔ خیام۔ تاج محل اور مرزا غالب کی روحانی، تہذیبی اور جمالیاتی قدروں پر مشتمل ہے اور جس میں جدید انسان کا روحانی انتشار بھی شامل ہے اور اس کی نئی قدروں اور نئے آدرشوں کی تلاش و جستجو کی بے پناہ تڑپ بھی۔ ان کے اسلوب میں گیتوں کی سادگی اور کلاسیکی شعری اسلوب کی خوشگوار رکھ رکھاؤ کی آمیزش ہے۔ ان کی آواز میں لوک گیتوں کی صحرائی وسعت۔ کلاسیکی ٹھہراؤ اور آتش نوا مغنی کا سوز ہے اوماشنکر جوشی کی شاعری یقیناً بڑی شاعری ہے کیونکہ وہ ایک بڑے ذہن اور دل دردمند کی پیداوار ہے۔ اور ہمارے قدر و احترام کی مستحق۔

خلیل الرحمن اعظمی

ادبی تاریخ اور اس کی تعلیم

اردو ادب کے سنجیدہ طلبہ اور معلمین کے درمیان غالباً اب اس بارے میں زیادہ اختلاف نہیں رہا کہ کسی ادبی کارنامے کی تحسین و قدر شناسی اور تجزیے و تحلیل کا عمل اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہمارے پاس تاریخی شعور نہ ہو۔ مگر تاریخی شعور کا صحیح مفہوم کیا ہے اس کے بارے میں ہمارا ذہن عام طور پر صاف نہیں ہوتا۔ اس لیے ادبی تاریخ لکھنے اور ادب کی تاریخ کو بطور ایک مضمون کے پڑھانے کے سلسلہ میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ کچھ لوگوں کے ذہن میں ادبی تاریخ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کے روز پیدائش سے لے کر اب تک جتنے بھی چھوٹے بڑے لکھنے والے پیدا ہوئے اور انھوں نے نظم یا نثر کی کسی صنف میں کسی نوعیت کی کوئی تحریر اپنی یادگار چھوڑی ان سب کا احاطہ تاریخی یا زمانی ترتیب کے ساتھ کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو ان لکھنے والوں کے سن ولادت و وفات اور ان کے حالات زندگی سے متعلق ضروری معلومات فراہم کر دی جائیں تاکہ اس طور پر ہماری زبان کی وسعت، ہمہ گیری اور اس کی کل پیداوار کا صحیح اندازہ ہو سکے اور ان لوگوں کی خدمات کا اعتراف بھی جنھوں نے اپنے خون جگر سے اس زبان کی آبیاری کی ہے یا اس کے سرمایے میں کسی نہ کسی نہج سے اضافہ کیا ہے۔ یہ جذبہ خود اپنی جگہ پر قابل قدر اور مستحسن ہے اور اس طرح کا کام جن لوگوں نے کیا ہے ان کی ریاضت اور جگر کاوی کی داد دینی چاہیے۔ چنانچہ پچھلے بیس پچیس برسوں میں اردو کے اہل قلم نے اس سلسلے میں بیش قیمت مواد فراہم کیا ہے۔ "دکن میں اردو" کے نام سے نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے جو کتاب ایک عرصہ بہت پہلے لکھی تھی اس کے مختلف ایڈیشن دیکھنے کا جن لوگوں کو اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس میں برابر نئی معلومات کا اضافہ ہوتا رہا ہے اور آخری ایڈیشن خاصا ضخیم ہو گیا ہے اس رجحان نے آگے چل کر پنجاب میں اردو، سندھ میں اردو، بنگال میں اردو، اڑیسہ میں اردو، میسور میں اردو، بھوپال میں اردو، بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، تذکرہ شعرائے رام پور اور تذکرہ شعرائے جے پور، جیسی کتابوں کو جنم دیا بلکہ اسی سے ملتی جلتی کچھ اور چیزیں وجود میں آئیں جیسے یورپین شعرائے اردو، ہندو شعرائے اردو، اردو ادب میں ہندوؤں کی خدمات، تذکرہ شاعرات اردو، اردو ادب میں خواتین کا حصہ وغیرہ۔ اس کے بعد اصناف اور تحریکوں سے متعلق چھان بین ہوئی۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، ریختی، مرثیہ، واسوخت، داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، انشائیہ، ادب لطیف، مکتوب نگاری، صحافت، بچوں کا ادب، فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، لکھنؤ کا دبستان شاعری، ادبی کا دبستان شاعری، علی گڑھ تحریک، جدید اردو شاعری، رومانوی تحریک، اردو ادب جنگ عظیم کے بعد، ترقی پسند ادب، نیا ادب، اردو ادب آزادی کے بعد۔ غرض اردو زبان و ادب کے تقریباً ہر پہلو سے متعلق ہمارے پاس معلومات کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس طرح کا سارا کام اپنی جگہ پر

برہم ناتھ دت

گل سرسبد

پھولوں کا فرشتہ جو لب بستہ کلیوں کو
صبح دم فردوس شبنم کے قطروں سے نہلانے پر مامور تھا
اتفاقاً ایک دن گلاب کے پودے تلے آیا اور وہیں سو گیا
خواب راحت سے بیدار ہوا تو اس نے
سرگوشی میں گلاب کے شگفتہ پھول سے کہا:
"اے پیکر حسن و جمال، رعنائی و لطافت کی جان
بزم چمن کی رونق اور شان تجھی سے ہے،
تیری فرحت بخش چھاؤں نے مجھے خوش وقت کر دیا
مانگ کیا مانگتا ہے تیرا کہا پورا ہوگا"
گلاب نے خوش ہو کر سادہ دلی سے کہا "میں کیا جانوں؟
جو تیرے جی میں آئے دے ڈال اسی سے لوں گا" یہ سن کر
فرشتہ پہلے تو کشمکش و پیچ میں پڑ گیا، اور دل ہی دل میں کہا
"گلاب کا پھول تو ابتدا ہی سے ہمہ صفت موصوف ہے
اس کے شایان شان سوغات کہاں سے لاؤں؟"
پل بھر کے بعد ہی وہ آپے میں آ گیا، دفعتاً اٹھا
اور کائی کا پرتو سمیٹ کر گلاب پر ڈال دیا
پھر انوکھی نرالی بات یہ ہوئی کہ
قدرت کے اس سادہ ترین پیراہن کو پا کر
گلاب کا پھول، پھولوں کا سرتاج بن گیا۔

مفید ہونے کے باوجود تاریخ ادب کا بدل نہیں قرار دیا جاسکتا گو کہ تاریخ ادب کی ترتیب و تدوین اور اس کی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں اس سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ دراصل ادب کا تاریخی شعور ادب کے حصے بخرے کرنے یا اس سے متعلق تفصیلات جمع کرنے سے نہیں حاصل ہو سکتا کیونکہ اس طور پر ہم ادب کو اجزا میں دیکھتے ہیں۔ ادب کو بحیثیت کل دیکھنے اس کی نامیاتی حرکت اور اس کے ارتقائی تسلسل کو دریافت کرنے اور اس کے تغیرات و انقلابات کے پیچیدہ عمل کا تجزیہ کرنے کے لئے ادبی بصیرت اور تنقیدی شعور کی زیادہ ضرورت ہے محض تحقیقی کاوش کافی نہیں، اگرچہ تحقیق کاوش خام مواد فراہم کرنے کے لئے ضروری ہے۔

خالص تحقیقی نقطۂ نظر اختیار کر لینے میں قباحت یہ ہے کہ ہم ادب یا ادبی تخلیقات کو کسی دائرے یا خانے میں مقید کر دیتے ہیں اور اس کا رشتہ پورے ادب سے منقطع کرکے اپنی تلاش و جستجو کا آغاز کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے ادبی معیار یا تنقیدی نقطۂ نظر نہیں ہوتا یا اسے ہم نظرانداز کرکے اپنے دائرے یا خانے ہی کو معیار مان لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی لکھنے والا" اردو ادب اور جنگ آزادی" "اردو شاعری میں وطنیت" یا اردو ادب میں ہندوستانی عناصر" کے قسم کا عنوان قائم کرکے اپنا کام شروع کرے تو وہ اس کی تکمیل کے لئے "جنگ آزادی" "وطنیت" یا "ہندوستانی عناصر" کو بنیادی اور مقدم چیز مان لے گا اور اسے ہر اس تحریر میں دیکھنا چاہے گا جو ادب یا شاعری سے ملتی جلتی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے مقصد کے لئے غالب، اقبال یا کوئی اور اہم شاعر و ادیب زیادہ کارآمد نہ ثابت ہو اور سیکڑوں ایسے ادبا و شعرا اس کے لئے اہمیت اختیار کر جائیں جو یا تو تیسرے اور چوتھے درجے کے لکھنے والے تھے یا سرے سے تخلیقی فنکار نہ تھے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ادب کے تاریخی مطالعے کا طریقہ یہ ہے کہ ماضی کے ادب کا تجزیہ کرنے اور اس پر رائے دینے کے لئے ہم اپنے زمانے کے ادبی معیار اور اقدار کو تھوڑی دیر کے لئے فراموش کر دیں اور ادیب کو خود اس کے زمانے میں رکھ کر دیکھیں اور اس زمانے کی یا خود اس ادیب کی اقدار کو پیمانہ بنائیں۔ جہاں تک ادیب کو خود اس کے زمانے میں رکھ کر دیکھنے کا سوال ہے وہاں تک تو ہمیں اتفاق ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اس سلسلے میں ان عوامل و محرکات کا پتہ چلایا جائے جو کسی ادبی کارنامے کو وجود میں لانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں یعنی اس دور کے تاریخی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی و ثقافتی اقدار، سماجی و اخلاقی اصول و قوانین سماجی و اخلاقی اصول و قوانین، نظام تعلیم و تربیت علوم و افکار کا سرمایہ اور ادبی و لسانی روایات وغیرہ لیکن اس بات کا خطرہ بھی ہے کہ ہم کہیں میکانکی سہل پسندی کے شکار نہ ہو جائیں کیونکہ کوئی زمانہ یا کوئی دور ایسا نہیں ہوتا جس کی قطعی حدبندی کی جاسکے اور اسے ماضی یا مستقبل سے علحدہ کرکے ایک مکمل وجود قرار دیا جاسکے۔ ہر حال اپنے ماضی سے منسلک ہوتا ہے اور اسی کی کوکھ میں مستقبل کی پرورش ہوتی رہتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ زندگی، زمانہ اور ماحول کے دائرے میں کسی عہد کے محض کچھ خارجی یا عمومی حالات ہی نہیں ہوتے ادیب کا اپنا انفرادی ماحول، اس کی ذاتی افتاد طبع اور شخصی مزاج، اس کے تجربات زندگی اور خارجی حالات سے اس کی اثر پذیری کی نوعیت اپنے بعض معاصرین کے مقابلے میں مختلف ہو سکتی ہے۔ ایک ہی زمانے میں بعض ادیبوں کی شخصیت سماجی و ادبی اقدار اور اسالیب و اظہار کے مروجہ سانچوں سے اثر قبول کرنے کے معاملے میں انفعالی ہو سکتی ہے اور بعض دوسرے ادیب انھیں جامد اور انحطاط پذیر سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ ان کی فعال شخصیت ان اقدار کو اپنے طور پر دریافت کرنے کا حوصلہ کر سکتی ہے جو ابھی زمانے کے بطن میں پوشیدہ ہوتی ہیں اور جن کی نمود کے لئے عام ذہن کو ابھی اور انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ بعض ادیبوں کی تخلیقات محض اپنے زمانے کے کچھ تقاضوں کی پیداوار ہوتی ہیں اور اسی زمانے میں مقید و محصور ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان کی تازگی اور تاثیر کچھ وقت گزرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور آگے چل کر ان کی اہمیت محض تاریخی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف کچھ ادبی تخلیقات ایسی ہوتی ہیں جن کا دائرہ اثر وسیع ہوتا ہے اور وہ ہر زمانے میں زندہ رہتی ہیں۔ ان میں عصری، قومی یا تہذیبی خصوصیات کے ساتھ کچھ عمومی اور آفاقی یا دائمی عناصر بھی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی ادیب کی تحریروں کے کچھ حصے ایسے ہوتے ہیں جو دیرپا ہوتے ہیں اور کچھ حصے محض تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ تاریخ ادب کے مطالعے میں اگر ہم خود اپنا کوئی تنقیدی نقطۂ نظر نہ رکھیں گے اور اپنی ادبی بصیرت کو کام میں نہ لائیں گے تو ہم ان دونوں عناصر کو الگ الگ نہ کر سکیں گے اور ہمارا مطالعہ محض تشریحی و توضیحی ہو کر رہ جائے گا یا ہم اس

عمل میں مبتلا ہو سکتے ہیں جسے رینے ویلک نے تاریخیت (HISTORICISM) سے تعبیر کیا ہے جس کے نتیجے میں ہم ہر قسم کے ادبی رجحانات اور ہر طرح کی ادبی تحریروں کے لئے تاریخی جواز اور تاویل پیش کرنے کی کوشش کریں گے اور زندہ اور مردہ روایت کا ہمیں ادراک نہ ہو سکے گا جو ادبی تاریخ کے مطالعے کا بنیادی مقصد ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تاریخ ادب کا مطالعہ کرتے وقت اپنے ذہن میں یہ بات رکھیں کہ اس کے ذریعہ ہمیں اپنی معلومات میں اضافہ نہیں کرنا ہے نہ ہر دور کے زیادہ سے زیادہ ادیبوں اور شاعروں کے نام، ان کے سن پیدائش و وفات یا ان کی تصنیفات کی مکمل فہرست یاد کرنا ہے بلکہ اس مطالعے کے ذریعہ ہمیں اپنے ادبی ذوق کی تربیت کرنی ہے اور ادب کا صحیح اور متوازن تنقیدی شعور پیدا کرنا ہے۔ ماضی کے ادب کو آج کے ادب کے رشتے میں اور آج کے ادب کو ماضی کے ادب کے رشتے میں دیکھ کر ادب کی نامیاتی وحدت، اس کا ارتقائی تسلسل، اس کی حرکیت اور اس کے امکانات کا صحیح ادراک کرنا ہے تاکہ خود ہم اپنے زمانے کی روح سے شناسائی حاصل کرسکیں۔ ادب کا تاریخی اور تنقیدی شعور ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ مرحوم شاعروں اور ادیبوں نے جو وراثت چھوڑی ہے اس کا کتنا حصہ ایسا ہے جو زندہ حقیقت اور زندہ روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو ادیب اس نکتے کو نہیں سمجھ پاتے وہ زمانۂ حال میں رہتے ہوئے بھی زمانۂ ماضی کا ادب پیدا کرتے ہیں جسے ہم روایتی ادب کہتے ہیں۔ یہ لوگ ادب، زندگی اور زمانے کا متحرک تصور نہ رکھنے کے سبب زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہوتے ہیں اور بقول فراقؔ ؎

جو خود مردہ ہیں وہ مردوں کے وارث بن نہیں سکتے

تاریخ ادب کا مطالعہ اگر اس سلسلے میں ہمارے شعور کو جلا دیتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ادبیات کی تعلیم کے سلسلے میں اس مضمون کی بے حد اہمیت ہے، ورنہ تشریحی، توضیحی یا معلوماتی ہونے کی صورت میں اسے پڑھانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ طلبہ کو کتابوں کی ایک فہرست دینی ہی کافی ہوگی۔

تاریخ ادب کی تعلیم کے سلسلے میں ہم نے جس طریق کار کو اپنانے کا مطالبہ کیا ہے اس سے اس مضمون کے پڑھنے اور پڑھانے میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اور یہ شعبہ خشک اور غیر دلچسپ ہونے کے بجائے طالب علموں کے لئے بامزہ اور نسبتاً زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک تو طالب علم کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اس پرچے کو تیار کرنے کے لئے بہت زیادہ باتیں یاد کرنے، بہت سے اعداد وشمار اکٹھا کرنے اور اپنے ذہن کو غیر ضروری معلومات سے بوجھل بنانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور نہ اس کے لئے نوٹس اور یادداشتوں کے پلندے کے پلندے تیار کرنے ہوں گے بلکہ بعض مسائل کو صحیح طور پر سمجھ لینا ہے اور سمجھ کر ادب کی مجموعی تفہیم میں اس سے مدد لینا ہے۔ دوسری طرف اساتذہ کو کتابوں کے اس ذخیرے کا حرف حرف پڑھنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ جن کی تعداد گھٹاتے گھٹاتے بھی پچاس سے کم نہ ہوگی اور جن کے صفحات کی مجموعی تعداد اندازاً دس ہزار ہو سکتی ہے۔ البتہ اب اساتذہ پر ایک نئی ذمہ داری یہ عائد ہوگی کہ وہ محض معلم و مدرس بن کر نہ رہیں۔ محض معلم و مدرس سے میری مراد ان لوگوں سے ہے جو اپنی دلچسپیاں نصابی کتابوں تک محدود رکھتے ہیں اور ادب سے ان کا تعلق صرف ان کے پیشے کی نسبت سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ نصاب کے علاوہ دوسری کتابیں اسی صورت میں پڑھتے ہیں جب وہ ان کے لئے امدادی کتب کا کام دے سکیں۔ تاریخ ادب کی صحیح تعلیم ادب کے طلبہ اور معلمین دونوں میں یہ احساس پیدا کر سکتی ہے کہ ہمیں وسیع تر معنوں میں ادب اور ادبی تخلیقات سے شغف رکھنے کی ضرورت ہے اور ادب کا اچھا ذوق اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتا جب تک ہم اپنے زمانے کے ادب اور ادبی تحریکات سے زندہ قسم کی دلچسپی نہ لیں۔ زمانۂ حال کے ادب سے اپنا رشتہ استوار کئے بغیر ہم ماضی کے ادب سے بھی صحت مند طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ نصابی کتابوں کی معنویت بھی اسی وقت ہم پر آشکار ہو سکتی ہے جب ہم ان کتابوں سے بھی دلچسپی لیں گے جو ابھی نصاب میں داخل نہیں ہوئی ہیں۔

ہم نے ادب کی کلیت اور اس کی وحدت و تسلسل پر جو اتنا زور دیا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ادبی تاریخ پڑھاتے وقت ہم اپنے ادب کو ادوار میں تقسیم نہ کریں۔ ادوار کی تقسیم دراصل اپنی سہولت کے لئے کی جاتی ہے البتہ ان کا جامد اور میکانکی تصور غلط ہے ہم کسی خاص دور کا تعین اس دور کے تاریخی حالات اور اقدار و تصورات کی نوعیت سے کریں گے۔ اس دور کی

ادبی روایات و اسالیب اور مختلف غالب رجحانات کو مدنظر رکھ کر اس کے مشترک اور متضاد و متصادم عناصر کا تجزیہ کریں گے لیکن اسے گرد سے الگ کر کے یا پورے ادب کے دھارے سے کاٹ کر نہ دیکھیں گے۔ مثال کے طور پر ہم چاہیں تو اردو ادب کو مندرجہ ذیل ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور جسے قدیم اردو کا دور کہنا چاہیے اس کا آغاز اردو نظم و نثر کے ابتدائی نمونوں سے ہوگا اور ہم اسے ولی پر ختم کر سکتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کا یہ تشکیلی دور ہے اس لئے اس کے تجزیے کا آغاز اردو زبان کی پیدائش سے ہوگا۔ جدید علم اللسان کی رو سے ہم ہندوستانی بولیوں کے سلسلے اور رشتے کو سمجھ کر اس کی ابتدا کا تاریخی تجزیہ کریں گے۔ اس دور میں ہم شمالی ہند، دکن، گجرات، پنجاب، اور دوسرے علاقوں کے ادبی نمونوں کی خصوصیات واضح کر کے ان کے امتیازات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ دکن کی ادبی مرکزیت کے تاریخی اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔ اس سلسلے میں ایک سوال اور اٹھتا ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنے بعض مضامین میں اس بات پر زور دیا ہے کہ جب ہندی بھی اردو کی طرح کھڑی بولی ہی کا ایک روپ ہے اور اس زبان کے مورخ و نقاد اپنی ادبی تاریخ کے تشکیلی دور میں ان شعراء کو بھی جگہ دیتے ہیں جو در اصل اودھی، برج بھاشا، بھوجپوری یا راجستھانی کے شاعر ہیں تو کیوں نہ ہم بھی کبیر، خانخاناں، میرا بائی، سورداس، اور نانک وغیرہ کے کلام کے کچھ حصے کو جو اردو سے قریب ہے اپنے یہاں جگہ دیں اور اسے قدیم اردو کے ذیل میں لائیں کیونکہ ان حضرات کے نزدیک یہ کلام دکنی کی نسبت ہمارے لئے زیادہ قابل فہم اور اردو کے اسلوب سے قریب تر ہے۔ دوسرا دور عہد ولی شاہ سے ۱۸۵۷ء تک رکھا جا سکتا ہے۔ اس دور میں بھی ہم نظم و نثر دونوں ساتھ ساتھ دیکھیں گے۔ دلی میں ایہام گوئی کی تحریک، پھر تازہ گوئی کا میلان اور میر و سودا کا زمانہ، دلی کا انتشار اور دہلوی شعراء کی مختلف مراکز کی طرف ہجرت، لکھنؤ کا ماحول اور اس کا اثر اردو نظم و نثر پر، لکھنؤ کی ادبی روایات کا اثر پھر دہلی کی شعراء پر، انیسویں صدی کے نصف اول میں مغربی اثرات کی نمود اور اس سلسلے میں فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کے نثری کارناموں کی خصوصیات۔

تیسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک رکھا جا سکتا ہے۔ اس دور میں نئی اور پرانی تہذیب کی کشمکش اور اس کے اثرات اردو ادب پر۔ اصلاحی تحریکات۔ انجمن پنجاب اور علی گڑھ تحریک، احیائی میلانات۔ بہ یک وقت جاگیردارانہ اقدار کا اثر اور نئی تعلیم کے اثر سے قومیت کا تصور۔

اس صورت سے چوتھا دور ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۵ء تک اور پانچواں دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک قائم کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں ان رجحانات کا بہت مختصر طور پر تجزیہ ہو سکتا ہے جو آزادی کے بعد سامنے آئے ہیں۔

مختلف ادوار پر لکچر تیار کرتے وقت ہم اس عہد کی سیاسی و تمدنی تاریخ اور اس دور کے عقائد و تصورات سے متعلق کتابوں کا مطالعہ ضرور کریں اور اس تحقیقی مواد کو بھی حسب ضرورت اپنے استعمال میں لائیں جو ادھر اُدھر بکھرا پڑا ہے لیکن اسے ایسا پس منظر نہ بنائیں جس کا اس دور کی ادبی تخلیقات سے ربط محض فرضی یا قیاسی ہو یا جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے اس پس منظر سے اثر پذیری کی نوعیت ایک ہی دور میں مختلف ادیبوں کے یہاں مختلف نوعیت کی ہو تو اس کو واضح کرنا بھی ضروری ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ رجحانات کا تجزیہ کرنے کے لئے انھیں شاعروں اور ادیبوں کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا جائے جو ان رجحانات کے اہم نمائندے ہوں۔ مردم شماری اور فہرست سازی کی ضرورت نہیں ہے گویا ادبی تاریخ کے مطالعے میں تاریخ، تحقیق اور تنقید کا ایسا تناسب ہونا چاہئے جو ہمیں صحیح نتائج تک پہنچنے میں مدد دے۔

تاریخ ادب کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ مختلف ادوار کی ادبی پیداوار کو تاریخی دستاویز سمجھ کر نہ پڑھیں گو کہ ایک مورخ یا محقق کے لئے یہ عمل بھی اپنی جگہ پر مفید ہے اور اس سے کسی دور سے متعلق بیش قیمت حقائق کا انکشاف ہو سکتا ہے لیکن ادبی تاریخ کے مطالعے میں ادب کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہئے اور تاریخ کو ثانوی۔ اسی طرح اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ ہم ادب کی تاریخ پڑھا رہے ہیں نہ کہ زبان کی۔ زبان کی تاریخ یا اردو کا لسانیاتی ارتقا اپنی جگہ پر خود ایک علم ہے اور اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ لسانیات بطور ایک مضمون کے اب ہمارے نصاب کا لازمی جزو بن گیا ہے اس لئے اس پہلو کے ساتھ پورا انصاف لسانیات کا استاد ہی کر سکتا ہے۔ البتہ حسب ضرورت ہم لسانیات کے علم

(باقی صفحہ [illegible] پر)

مراسلات

دیوان غالب اپریل فول اور اہل تحقیق

۸ر جنوری ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کا مضمون "دیوان غالب اپریل فول اور اہل تحقیق" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں جس قصے کا مذکور ہے وہ میرے ایک نوٹ غالب اور بھوپال مشمولہ اردوئے معلیٰ غالب نمبر فروری ۱۹۶۰ء سے شروع ہوا۔ اس میں میں نے مالک رام صاحب کا ذکر کرتے ہوئے دو جملے ناشائستہ انداز میں لکھ دئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح میری زبان قلم سے نکل گئے مجھے ان پر قلق ہے۔ اگر زبان اور قلم سے نکلی ہوئی بات کو واپس لینا ممکن ہو تو میں ان جملوں کو واپس کھینچ لینا چاہوں گا۔ فکر و نظر میں نسخۂ عرشی پر تبصرہ کرتے ہوئے مالک رام صاحب کو انھیں سے اشتعال ہوا اور وہ برق ہو گئے۔

اس مضمون میں مالک رام صاحب نے مجھ سے دو سوال پوچھے تھے جن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ نے ہمایوں میں وہ غزل دیکھی تھی یا نہیں؟ اگر دیکھی تھی تو کیا کیا؟ اطلاعاً عرض ہے کہ اپریل ۱۹۲۹ء میں میں نے ہائی اسکول کا امتحان دیا۔ میں کب ان بکھیڑوں کا شعور رکھتا تھا۔ مالک رام صاحب نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ الحاقی غزل کے اصل مصنف کی دریافت خود میری تلاش کا نتیجہ ہے، صحیح ہے لیکن کم از کم میں نے اس دریافت کو کسی رسالے یا کتاب میں شائع شدہ نہ دیکھا تھا۔ میں نے اپنے طور پر بھوپال میں اصل مصنف کا انکشاف کیا تھا۔

(ڈاکٹر گیان چند جین)

بہار میں اردو شعر و ادب

جناب نثار احمد صدیقی کا ایک خط مذکورہ عنوان کے تحت ہماری زبان کے ۸ر جنوری ۱۹۶۹ء میں نظر سے گذرا۔ مسرت ہوئی کہ موصوف بہار کے قدیم سرمایۂ شعر و ادب سے واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن افسوس ہوا کہ موجودہ بہار کے ادبی ماحول پر ان کی نظر نہیں ہے۔ بہار کے موجودہ شعر و ادب میں سے صرف "شعرا" ہی کو لے لیجئے تو جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کی ایک اہم درمیانی کڑی پرویز شاہدی مرحوم بھی تو ہیں۔ کلیم الدین احمد کو نہ بھی تسلیم کیجئے تو ان کے علاوہ اختر اورینوی اور اختر قادری کی شاعرانہ حیثیت بھی مسلم ہیں۔ دوسرے گروپ میں مظہر امام، حسن نعیم، منتظر شباب، انیس امام، سہیل واسطی، احمد عظیم آبادی، نوشاد نوری، وفا ملکپوری، ظفر حمیدی، احسان دربھنگوی، اویس احمد دوراں وغیرہ ایسے فنکار ہیں جو معروف و مقبول ہو چکے ہیں۔ تیسرے گروپ میں شاہین غازی پوری، سلطان اختر، لطف الرحمٰن، ارباب دانش، پرکاش فکری، صبا اکرام، شاہد احمد شعیب، سید احمد شمیم، شکیب ایاز، اور متعدد دوسرے ایسے شعراء ہیں جن کی تخلیقات پابندی کے ساتھ ہند و پاک کے رسائل میں چھپتی رہی ہیں اور مختلف تنقید نگاروں نے ان میں سے بیشتر شعراء کے حوالے اپنے مضامین میں دئے ہیں۔

(قمر اعظم ہاشمی)

استفسارات

ایک مضمون کی تیاری کے سلسلے میں ایک صاحب کو چند معلومات و اقتباسات کی ضرورت ہے اگر کوئی صاحب علم رہنمائی فرمائیں تو باعث شکرگزاری ہوگا۔ امید ہے اخبار کے نام، تاریخ، صفحہ، کالم وغیرہ کی صراحت کے ساتھ "ہماری زبان" میں اشاعت کے لئے بھیج دیں گے۔

۱۔ فروری ۱۹۵۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے یوم غالب پر ایک اجتماع میں تقریر فرمائی تھی۔ اس کی روداد و تقریر ہندوستانی اخبارات میں آئی تھی۔

۲۔ ہندوستان میں غالب مرحوم پر جو فلم بنی تھی کسی صاحب نے اس کے غیر معیاری اور صحت سے عاری ہونے کی مولانا سے شکایت کی تھی لیکن حضرت مولانا نے اس اعتراف کے باوجود اس فلم کی ضرورت و افادیت پر زور دیا تھا۔ یہ روایت بطور خبر یا کسی مضمون میں نظر سے گذری تھی۔

۳۔ ہندوستان میں غالب کا یادگاری ڈاک کا ٹکٹ جاری کیا گیا تھا۔ اگر یہ مسئلہ ہندوستانی پارلیمنٹ یا کسی کمیٹی میں زیر بحث آیا ہو اور حضرت مولانا نے اس موقع پر کسی خیال کا اظہار فرمایا ہو۔

۴۔ ملک کی آزادی کے بعد کسی تحریر، تقریر، بیان یا گفتگو میں حضرت مولانا نے غالب مرحوم کے متعلق اگر کچھ کہا ہو۔

(ابو سلمان)

"ہماری زبان"

کو مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ خیال رہے کہ وہ ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

(ادارہ)

انجمن ترقی اردو راجستھان کے وفد کی لسانی اقلیتی کمشنر سے ملاقات

۹ جنوری کو انجمن ترقی اردو راجستھان کا ایک وفد لسانی اقلیتی کمشنر سے بمقام کینٹی ہال سکریٹریٹ راجستھان جے پور میں ملا۔ منجانب انجمن جو میمورنڈم پیش کیا گیا۔ اس کا متن یہ ہے۔ ارچند واقعات آپ کی توجہ کے لئے ذیل میں درج ہیں (۱) گورنمنٹ کے مقرر کردہ اصول ۱۰ یا ۴۰ طلبہ کی شرط پوری ہونے کے باوجود بھی راجستھان میں ایسے کثیر پرائمری اسکول ہیں جن میں اردو میڈیم جاری نہیں۔ ایسے اسکولوں کے گوشوارے اب سے پہلے دو بار پیش کئے جا چکے ہیں اور اب بذریعہ ہذا صرف شہر جے پور ہی کے ایسے پرائمری اسکولوں کی فہرست پیش ہے جن میں یہ شرط پوری ہونے کے باوجود درجہ پنجم تک اردو غائب ہے۔ اس سلسلہ میں ہیڈ ماسٹروں کی بے توجہی اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ محلہ مہاوتان جے پور کے گورنمنٹ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے پہلے سے اردو میڈیم جاری ہونے اور پچاس ساٹھ طلبہ ہونے کے باوجود اپنے آپ اردو کی تعلیم بند کر دی جس کی شکایت کی جا چکی ہے۔ (۲) مڈل اسکول میں بھی مقررہ شرط پوری ہونے کے باوجود شاذ و نادر ہی کہیں اردو جاری ہے۔ جے پور میں تو ۱۳ مڈل اسکول میں سے ایک میں بھی اردو نہیں ہے۔ جن کی فہرست شامل ہے۔ (۳) جہاں تک انجمن کو علم ہے کوئی بھی سکنڈری اسکول ایسا نہیں ہے جس میں اردو بحیثیت اختیاری مضمون کبھی جاری ہو اور بحیثیت تھرڈ لینگویج کبھی منظور ہوئی کہ ہائر سکنڈری اسکول، مانک چوک ہٹی پریپر سکنڈری اسکول، پوتدار ہائر سکنڈری اسکول وغیرہ اور بعض جگہ تو معلق ہے ہی نہیں۔ مثلاً دربار سکنڈری اسکول جے پور وغیرہ۔ (۴) پرائمری اسکولوں کے لئے جو کتابیں گورنمنٹ راجستھان نے چھپوائیں وہ بے حد غلط چھپیں۔ اس کی بابت کئی بار عرض کیا گیا۔ اغلاط نامے بھی بار بار پیش کئے گئے۔ سابق چیف سکریٹری صاحب نے سکریٹری صاحب نیشنلائزیشن ٹیکسٹ بکس بورڈ آف راجستھان کو میٹنگ میں تاکید کے ساتھ درستی کا حکم بھی دیا۔ مگر برسوں گذر جانے کے باوجود کچھ بھی نہ ہوا۔ ہزار ہا روپیہ اردو سے بے توجہی کے باعث برباد ہو گیا اور طلبہ صحیح تعلیم سے محروم رہ گئے۔ اور اب تو کہا جاتا ہے کہ یہ کتابیں ہی کورس سے خارج کر دی گئی ہیں۔ لہذا کوئی کتاب اردو والوں کے لئے درجہ سوم سے درجہ پنجم تک نہ رہی۔ (۵) مڈل کلاسوں اور سکنڈری اور ہائر سکنڈری کلاسوں کی کورس کی کتابیں نہ ملنے کی بھی عام شکایت ہے۔ (۶) اردو کے اساتذہ نہ ملنے کے عذر کی بنا پر بھی جگہ جگہ اردو سے طلبہ محروم ہیں۔ (۷) ہیڈ ماسٹروں کا رویہ بالعموم اردو والوں کے ساتھ مخالفانہ رہتا ہے اور ان کی شکایت کا کوئی اثر نہیں لیا جاتا اس لئے یہ سلسلہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا۔ سالہا سال گذر جانے کے باوجود اب تک وہی کیفیت اور شکایت ہے کہ جو مدت سے چلی آتی ہے۔ اس لئے اگر سردست بطور امتحان صرف جے پور ڈویژن ہی کے لئے ایک با اختیار لیزان آفیسر عارضی طور پر مقرر کر کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو بہت سی حقیقتیں اور شکایتیں سامنے آکر ختم ہو سکتی ہیں۔ یا کم از کم یہ ہو کہ کسی ذمہ دار افسر کو خاص خاص شہروں مثلاً جے پور۔ ٹونک۔ کوٹہ اور اجمیر وغیرہ کے لئے مامور کیا جائے کہ وہ بر سر موقع انجمن ہذا کے نمائندے کی موجودگی میں ایسے اسکولوں کا جن میں اردو کے طلبہ موجود ہیں جائزہ لے کر جلد سے جلد رپورٹ کریں تو امید ہے کہ بہت کچھ معاملات صاف ہو سکتے ہیں۔ نمائندہ انجمن کی موجودگی پر خاص طور پر توجہ فرمائی جائے اور ضروری تصور کی جائے۔ (۸) گورنمنٹ راجستھان نے مہربانی فرما کر شکایات دور کرنے کی غرض سے ایک اردو کمیٹی کی تشکیل ۱۸ دسمبر ۷۴ کو فرمائی تھی۔ جس کی سال میں دو میٹنگ ہونا طے کیا گیا ہے مگر صرف دو ہی میٹنگ ۲۷ فروری ۷۵ اور ۲ ستمبر ۷۶ کو ہونے کے بعد کچھ نہیں ہوا معلوم نہیں کہ وہ اب برقرار بھی ہے یا نہیں۔ یہ نہایت مفید اقدام تھا۔ مگر برقرار نہ رہا۔ لہذا اسکو دوبارہ عمل پیرا ہونا چاہئے (۹) ساہتیہ اکیڈیمی راجستھان۔ ایک نیم سرکاری ادارہ ہے۔

جس کے مقصد میں اردو کی ترقی بھی شامل ہے۔ مگر انجمن ترقی اردو راجستھان جیسے ادارے کو جس کی راجستھان میں چالیس سے زائد شاخیں ہیں نمائندگی اس لئے نہیں دی جاتی کہ وہاں اردو کشی کی جارہی ہے۔ اور یہ فریاد کوئی نہیں سنتا۔ حد تو یہ ہے کہ اگر اردو کے لئے کوئی لب کشائی کرتا ہے تو اس کو استعفار دئے بغیر ہی مستعفی قرار دیدیا جاتا ہے۔ اس اکیڈمی کو دس ہزار روپیہ سالانہ ۷۴ سے اردو کی کتابیں چھاپنے کے لئے گورنمنٹ راجستھان سے مل رہا ہے۔ مگر آج تک اردو کی اردو میں ایک کتاب بھی نہیں چھاپی گئی۔ حالانکہ انجمن نے کئی کتابیں پیش کیں جو اکیڈمی نے پسند کرنے چھاپنا چاہے بھی گیا مگر آج تک کوئی کتاب نہ چھاپی۔ لہٰذا اردو کی نمائندگی کے لئے انجمن ہٰذا کو موقع ملنا چاہئے۔ اور گورنمنٹ کی مقررہ رقم برائے طباعت کتب اردو ان کی طباعت پر صرف ہونی چاہئے۔ (۱۰) گورنمنٹ راجستھان نے طے کیا تھا کہ جملہ قوانین اردو بھی شائع ہوں گے اور اس کام کو شروع بھی کیا گیا۔ مگر اب تک کوئی قانون اردو میں شائع نہیں ہوا۔ بلکہ معلوم ہی ہے کہ اب اس سلسلہ کو ختم ہی کر دیا گیا ہے ۱۰ رفروری کو کمشنر صاحب موصوف کو گورنمنٹ پرائمری اسکول پہاڑ گنج جے پور۔ اور گورنمنٹ پرائمری اسکول محلہ جہاد بان کا معائنہ بھی کرایا گیا۔ اور شکایات کو بھی باور کرایا گیا۔ امید ہے کہ ارکان انجمن کی جد و جہد سے اردو کے متعدد معاملات جلد ہی خاطر خواہ طے ہو جائیں گے۔ (نامہ نگار)

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

۲۸۔ ہندوستانی حکمرانوں کے سیاسی اصول	ڈاکٹر اشور چند توپا	۲۱ر۲۵
۲۹۔ ہندوستانی اخبار نویسی	محمد عتیق صدیقی	۱۲ر۰۰

دوسرے اداروں کی کتابیں (رعایت ۲۵ فی صدی)

۱۔ بہار طفلی	تلوک چند محروم	۳ر۵۰
۲۔ بچوں کی دنیا	تلوک چند محروم	۴ر۰۰
۳۔ کاروان وطن	تلوک چند محروم	۶ر۵۰
۴۔ شعلۂ نوا	تلوک چند محروم	۹ر۵۰
۵۔ عقیدت کے پھول	جگن ناتھ آزاد	۱ر۰۰
۶۔ بیسویں گذشتہ روزو شب	جگن ناتھ آزاد	۱ر۲۵
۷۔ تلوک چند محروم	جگن ناتھ آزاد	۴ر۰۰
۸۔ وطن میں اجنبی	جگن ناتھ آزاد	۲ر۵۰
۹۔ متاع تسکین	تسکین قریشی	۳ر۰۰
۱۰۔ فسانۂ سرور	ڈاکٹر حکم چند نیر	۲ر۰۰
۱۱۔ ریختۂ ولی	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۱ر۵۰
۱۲۔ اردو زبان و ادب		۲ر۰۰
۱۳۔ فروزاں	ڈاکٹر معین احسن جذبی	۲ر۲۵
۱۴۔ رنگ جاں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۲ر۵۰
۱۵۔ مرقع غالب	پرتھوی چندر	۱۲ر۰۰
۱۶۔ دیوان درد	ظہیر احمد صدیقی	۲ر۶۰

مہتمم مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ

باقی صفحہ ۸ سے آگے

ادبی تاریخ میں بھی کام لیں گے خاص طور پر تشکیلی دور کے تجزیے میں یا بعض ان مقامات پر جب نئے تاریخی، تہذیبی یا تعلیمی اثرات سے اسالیب میں نمایاں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔

آخر میں اس بات کی مزید یاد دہانی کی ضرورت ہے کہ ہم ادبی تاریخ کو اردو سرپرستی کی رپورٹ کے قسم کی چیز نہ بننے دیں تو اچھا ہے۔ جیسے اس کام کی اپنی اہمیت اور افادیت مسلم ہے اور ہماری یہ زبردست خواہش ہے کہ اردو زبان کے تمام چھوٹے بڑے معروف اور غیر معروف لکھنے والوں کا ایک مکمل اور مستند تذکرہ یا سوانحی لغت تیار کیا جائے اور ایک "قاموس الکتب" کی اشاعت بھی عمل میں آئے جس میں اردو زبان کی ہر کتاب سے متعلق وضاحتی نوٹ ہو۔ اس طرح کی کتابیں حوالے کے لئے بے حد کارآمد ہوں گی۔ مگر ادبی تاریخ کی تعلیم سے اسے خلط ملط نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ اس صورت میں ہمارا کام بھی آسان ہو جائے گا اور یہ مطالعہ طلبہ اور معلمین دونوں کی ذہنی تربیت اور ادبی بصیرت میں اضافے کا موجب ہوگا۔

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر انجمن کی مطبوعات پر رعایت

انجمن نے اپنی مطبوعات پر ۲۵ اور ۴۰ فی صدی کی خصوصی رعایت اس موقع کے لئے منظور کی ہے۔ یہ رعایت یکم فروری سے ۲۸ فروری تک رہے گی۔

پچیس فی صدی کی کتابیں

۱	اردو صرف و نحو	مولوی عبد الحق	۱/۲۵
۲	اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے اکرام کا کام	مولوی عبد الحق	۱/۰۰
۳	اردو ہندی لغت	انجمن ترقی اردو ہند	۲۰/۰۰
۴	اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر محمد عزیر	۹/۵۰
۵	انتخاب شرح دیوان مومن	حامد حسن قادری	۳/۵۰
۶	انتخاب کلام میر	مولوی عبد الحق	۲/۵۰
۷	تنقیدیں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۶/۰۰
۸	تین مغربی ڈرامے	مجنوں گورکھپوری	۷/۰۰
۹	چند ہم عصر	مولوی عبد الحق	۱/۵۰
۱۰	خطوط غالب	مالک رام	۷/۵۰
۱۱	خواب شیریں	جے کرشن چودھری	۲/۰۰
۱۲	زنداں نامہ	فیض احمد فیض	۲/۲۵
۱۳	سن ساون	پنڈت سندر لال	۲/۰۰
۱۴	شکنتلا اردو	بیگم قدسیہ زیدی	۲/۰۰
۱۵	غالب ایک مطالعہ	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۶/۰۰
۱۶	غزل اور درس غزل	اختر انصاری	۲/۰۰
۱۷	گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	۷/۰۰
۱۸	محاسن کلام غالب	ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری	۱/۰۰
۱۹	مشترکہ زبان	گاندھی جی	۰/۵۰
۲۰	مضامین رشید	رشید احمد صدیقی	۶/۰۰
۲۱	مقالات حالی	مولوی عبد الحق	۳/۲۵
۲۲	نئے ڈرامے (جدید ایڈیشن)	ڈاکٹر محمد حسن	۵/۰۰
۲۳	یادگار حالی	بیگم صالحہ عابد حسین	۴/۵۰

چالیس فی صدی کی کتابیں

۲۴	اردو ساہتیہ کا اتہاس (ہندی)	ڈاکٹر احتشام حسین	۶/۲۵
۲۵	اسلامی فن تعمیر	مبارز الدین رفعت	۴/۰۰
۲۶	اخلاقی سماجیات	ڈاکٹر جعفر حسن	۴/۵۰
۲۷	الایام (اردو)	ڈاکٹر طہ حسین، سید عبد الباقی اسلامی (ترجمہ)	۱۰/۰۰
۲۸	انجم کدہ	عزیز لکھنوی	۲/۵۰
۲۹	انواع فلسفہ	ظفر حسین خاں	۸/۵۰
۳۰	آئینۂ حقیقت	پنڈت حبیب الرحمن شاستری	۲/۰۰
۳۱	باپو کے قدموں میں (ہندی)	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۱۵/۰۰
۳۲	بھگوت گیتا (اردو)	اجمل خاں	۲/۵۰
۳۳	بچوں کے ادب کی خصوصیات	بشیر فاطمہ	۱/۰۰
۳۴	پرچھائیں	آصف علی	۴/۰۰
۳۵	تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲/۰۰
۳۶	تذکرہ شعرائے جے پور	احترام الدین احمد شاغل	۶/۵۰
۳۷	تذکرہ گلشن سخن	مسعود حسن رضوی	۶/۰۰
۳۸	حیات اجمل	قاضی عبد الغفار	۸/۰۰
۳۹	دھمپد	منور لکھنوی	۲/۰۰
۴۰	دیمک کی کہانی	ڈاکٹر عبد البصیر خاں	۴/۰۰
۴۱	روزگار شرح سودا اور زر	ابو سالم	۸/۵۰
۴۲	سوگوار یاد	رحم علی الہاشمی	۲/۲۵
۴۳	سیر افلاک	حکیم احمد	۸/۰۰
۴۴	سیاسیات کے اصول (دکنی)	ہارون خاں شروانی	[illegible]
۴۵	شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	۵/۰۰
۴۶	شکنتلا (ہندی)	بیگم قدسیہ زیدی	
۴۷	صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات	محمد عتیق صدیقی	۹/۰۰
۴۸	صحیفۂ خوشنویسان	احترام الدین احمد شاغل	۹/۰۰
۴۹	ظاہر و باطن (ڈراما)	محمد فضل الرحمن	۱/۲۵
۵۰	فائز دہلوی اور دیوان فائز	مسعود حسن رضوی	۵/۵۰
۵۱	فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۲/۰۰
۵۲	فن تحریر کی تاریخ	محمد اسحاق صدیقی	۷/۵۰
۵۳	کاروان حیات	نجم الدین شکیب	۹/۵۰
۵۴	کچھ زر کی بابت	ابو سالم	۰/۵۰
۵۵	کچھ ذرے کچھ تارے	آنند نرائن ملا	۲/۵۰
۵۶	کلام سودا	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۶/۰۰
۵۷	کلیات شاہی	مبارز الدین رفعت	۳/۰۰
۵۸	گاندھی جی اور نہرو کی راہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۸/۰۰
۵۹	مدر انڈیا کشش	منور لکھنوی	۳/۵۰
۶۰	مذہب اور دھرم	مہاتما گاندھی	۰/۰۰
۶۱	مرزا محمد رفیع سودا	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۰/۵۰
۶۲	مرقع افغان	ابرار حسین فاروقی	۳/۲۵
۶۳	مطالعہ حضرت غمگین	یونس خالدی	۳/۰۰
۶۴	نفسیات اور جنسی انتخاب	محشر عابدی	
۶۵	نسیم مغرب	اے۔ بی۔ بہار	۴/۵۰
۶۶	نغمات افزا	دل الرحمن	۱/۰۰
۶۷	نئی روشنی (ڈراما)	محمد فضل الرحمن	۱/۲۵

باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲ پر

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپا یا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا